تصوّرات

علامہ اقبالؒ کا تصورِ آدم — خلقی اور فطری شرف

پروفیسر محمد منوّر

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو
فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حور
کہ شاہینِ شہِ لولاک ہے تو

چند سال ہوئے، راقم الحروف نے ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم کیا جس کا عنوان تھا:

"ابو المعانی مرزا عبد القادر بیدؔل ——— مدرّسِ خودی" ———

اس مقالے کا اختتام حضرت بیدؔل کے شعرِ ذیل پر ہوا تھا

؎ بحُسنِ خویش نگاہی کہ در جہانِ ظہور

خطابِ 'احسنِ تقویم' داری از خلّاق! [۱]

ایک نظر اپنے جمال پر بھی ڈال ۔ اس جہان میں جہاں بے شمار جلوے بے نقاب ہیں، خدا نے تجھی کو 'احسنِ تقویم' کے خطاب سے نوازا ہے ۔ اشارہ تھا اس آیۂ کریمہ کی جانب:

"لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" [۲] ———

ہم نے انسان کو بہترین اندازے، بہترین سانچے، بہترین قوام و عناصر، بہترین توازن اور بہترین تناسب کے ساتھ خلق کیا ———

مرزا عبد القادر بیدؔل دیگر اہلِ نظر انسان دوست، دردمندوں کی طرح آدم کی ناخودشناسی کے شاکی تھے، یہ موضوع حضرت علامہ اقبال کی شاعری اور نظامِ فکر میں نمایاں ترین موضوع کے طور پر طالبِ توجّہ ہے، جیسا کہ وہ "اسرارِ خودی" کے آغاز میں لکھتے ہیں

؎ بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست

تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست [۳]

آئندہ صفحات میں اسی موضوع کے پرت کھولنے، آدم کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرنے اور کون و مکاں میں، اس کی اصل حیثیت کو بحال کرنے کی، بحوالۂ اقبال، کوشش کی گئی ہے ۔ ہم اسے مجملاً "بحالیاتِ آدم" کا مضمون قرار دے سکتے ہیں ۔ بقول حضرت علامہ

؎ یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار

کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار [۴]

کون نہیں جانتا کہ حضرت علامہ نے بھی عام اُردو شعر کی طرح شاعری کا آغاز غزل سے کیا تھا، یہ نہیں کہ حضرت علامہ نے نظمیں نہیں کہیں، تاہم آغازِ کار میں توجہ کا مرکز عموماً غزل ہی رہی ـــــ حضرت علامہ بھی دیگر شعراء کی طرح ایک مدت تک مقبولِ عام مضامین قلمبند کرتے رہے، مُراد ہے کہ وہ بھی غزل کی مروّج ہر دلعزیز روش پر گامزن رہے ـــــ یہی سبب ہے کہ داغ دہلوی کو اپنے لیے موزوں استاد جانا۔ ظاہر ہے اگر ان کو اس دَور میں حضرت داغ کا اندازِ غزل گوئی پسند نہ ہوتا تو وہ ان کی خدمت میں اپنی غزلیں برائے اصلاح نہ بھیجا کرتے۔ یہ مسئلہ جدا ہے کہ یہ مراسلاتی تلمذ بھی زیادہ مدت جاری نہ رہا مگر یہ امر بہر حال عیاں ہے کہ حضرت علامہ نے استاد داغ دہلوی سے فقط اصلاح ہی نہ لی بلکہ ان کے طرزِ بیان سے متاثر بھی ہوتے؛ چنانچہ اس طرز میں بہت سی غزلیں قلمبند کیں ـــــ نظموں کا لب و لہجہ مختلف رہا ـــــ پھر جب ذرا خود آگاہ ہوتے تو غزل کی تقلیدی روش ترک کر کے الگ ہو رہے ـــــ حتّٰی کہ جب "بانگِ درا" کی ترتیب کے وقت اپنا اُردو کلام منتخب کرنا شروع کیا تو "داغی" غزلیں طاق متروکات کی زینت بن کر رہ گئیں۔ "باقیاتِ اقبال" مرتبہ عبدالواحد معینی میں اور ایک آدھ، دیگر کتب میں ایسی کئی غزلیں آرام فرما ہیں، اور یاد دلاتی ہیں بالفاظ اقبال ؎

مدت ہوئی گزرا تھا اسی راہ گزر سے۔

حضرت علامہ نے جس دَور میں داغ دہلوی کو استاد پکڑا، اس دَور میں مولانا الطاف حسین حالی اور اکبر الہ آبادی ابھی زندہ و سلامت تھے۔ ان دونوں کی شاعری کا بھی چرچا تھا۔ مگر جس طرح کے مشاعرہ زُبا اور سقف شگاف مضامین داغ و اکبر اور ان کے شاگردانِ گرامی باندھ رہے تھے، ان کے مقابل اکبر و حالی واماندگانِ راہ دکھائی دیتے تھے۔ قدرتی امر ہے کہ جواں امنگوں اور پُرشباب جذبوں والے اُس دَور کے اقبال کو اکبر اور حالی پیچھے بھی کیوں۔ یہ بات اپنی جگہ درست کہ آگے چل کے انہوں نے اپنی "ہر لحظہ نیا طُور، نئی برقِ تجلّی" کی خواہاں طبیعت کے باعث اسلوبِ بیان بھی بدل لیا اور مضامین بھی۔ یعنی وہ غزلیہ شاعری ترک کر دی جس کا محور زُلف و رخسار، شراب و شاہد، قاصد و دربان اور ہجر و وصال کی نقشہ کشی تھا ـــــ پھر جب شاعری کا محور بدل گیا تو محاورہ بھی بدل گیا، اور ہوتے ہوتے آخر وہ وقت بھی آیا جب حضرت علامہ پکار اُٹھے کہ ان کو اُن معروف معانی میں شاعر گمان ہی نہ کیا جائے جن کی رُو سے ہوائے مقبولیت کے رُخ چلنے والے اہلِ ہوا شعرائے کرام متصوّر ہوتے ہیں۔

؎ نہ پنداری کہ من بے بادہ مستم
مثالِ شاعراں افسانہ بستم
نہ بینی خیر ازاں مردِ فرو دست
کہ برمن تہمتِ شعر و سخن بست
بکوئے دلبراں کارے ندارم
دلِ زارے، غمِ یارے ندارم
بہ جبریلِ امیں ہمداستانم
رقیب و قاصد و درباں ندانم ؎۵

مگر ہر دلعزیزی کی ہوائے خود نمائی سے پنڈ چھڑانا اور ایک بیگانہ روش اختیار کرنا، یہی نہیں، اُس روش کی طرف دوسروں کو بھی بلانا کوئی معمولی فیصلہ نہ تھا۔ اس فیصلے کی عزیمت طلبی سے غیر شاعر حضرات بخوبی آگاہ نہیں ہو سکتے۔ اس کا اندازہ فضلائے مقبولیت میں بلند پرواز اور شہرت شکار شعرائے محترم ہی کر سکتے ہیں ـــــــ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ شعراء کی متذکرہ الیہ پسندیدہ اور عام طرزِ فکر اور نہج الفصاحت فقط اس دَور کے 'برِ عظیم' پاک و ہند ہی میں غالب و قاہر نہ تھی بلکہ انگلستان کے شعراء کا بھی تقریباً یہی عالم تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اس ضمن میں ہربرٹ ریڈ کا حوالہ دیا ہے۔ ہربرٹ ریڈ نے 'اسرارِ خودی' کے باب میں اظہارِ رائے کرتے ہوئے کہا:

"ادب کے فنکارانہ اظہار کا نقطۂ عروج اور ثمر، اور انسانی روح سے وابستہ مسرت کی آخری حد مابعد الطبیعیات میں ہے۔ اس میں روحانی دنیا کے اسرار و رموز بھی نمایاں ہیں۔ اس میں انسانی روح اور ہمارے تشخص کی لافانی عمل پذیری کا مستند بھی شامل ہے۔ ہر عہد میں انسانی ذہن کی اس سے پرداخت ہوتی ہے، اور مستقبل میں بھی یہی ہوگا۔ صرف یہی ایک موقع ہے جہاں ہم سب، رنگ و نسل اور زمان و مکان سے ماورا ہو کر، مساوی ہو جاتے ہیں" ؎۶

ذرا آگے چل کر 'ہربرٹ ریڈ' نے 'والٹ وہٹمین' کی شاعری کے انسانی و آفاقی عناصر پر بحث کرتے ہوئے، وضاحت کی ہے:

"ان توضیحات کی شرائط کی بجا آوری کے باوجود وہٹمین کا یہ تصور

ادب کی عمل پذیری اور اس کے بلا واسطہ استعمال کا ایک ارفع تصور ہے۔ اس تصور کے معیار پر اگر آج کے اپنے شعرا کی پرکھ کی جائے تو مجھے صرف ایک ہی ایسا زندہ شاعر نظر آتا ہے جو کم عیار ثابت نہ ہوگا، اور یہ بھی طے ہے کہ وہ ہمارے عقیدے اور نسل کا شاعر بھی نہیں۔ میری مراد محمد اقبال سے ہے جس کی مثنوی "اسرارِ خودی" کا حال ہی میں ڈاکٹر رینالڈ نکلسن نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے اور جسے میسرز میکملن نے طبع کیا ہے۔ آج جبکہ ہمارے مقامی متشاعر اپنے بے تکلف احباب میں بیٹھے "کیٹس" کے تتبع میں کتّوں، بلیّوں اور ایسے ہی گھریلو موضوعات پر طبع آزمائی کر رہے ہیں تو ایسے میں لاہور میں ایک ایسی نظم تخلیق کی گئی ہے جس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ اس نے مسلمانوں کی نوجوان نسل میں طوفان برپا کر دیا ہے، اور ان میں سے ایک کے بقول "اقبال ہمارے لیے مسیحا بن کر آیا ہے۔ اور اس نے مُردوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی ہے۔" ثہ

جیسا کہ سطورِ آغاز میں بیان ہوا، علامہ اقبال نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی قلمبند کیں۔ حق یہ ہے کہ اکثر نظموں پر تفکّر و تفلسف کا وہ سماں چھایا ہُوا ہے جو ابتدائی غزلوں میں نسبتاً بہت کم نظر آتا ہے۔ اولادِ آدم کے شب و روز اور ان کی کشمکش کے مضامین حضرت علامہ کی اُن نظموں میں جلوہ فرما ہیں جو انہوں نے انگلستان جانے سے قبل تحریر کیں، مثال کے طور پر "انسان اور بزمِ قدرت" جس میں بتایا گیا ہے کہ تخلیقِ کائنات کا مقصود ظہورِ آدم ہے۔ چنانچہ صبح، آدم کے ایک سوال کے جواب میں کہتی ہے

؎ ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود
باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود ثہ

اسی حصہ اوّل میں ایک اور نظم ہے جو اس موضوع کی نسبت سے بہت اہم ہے، عنوان ہے "سرگزشتِ آدم"، یہ نظم اس قابل ہے کہ سر تا سر درج کر دی جائے ؎

سُنے کوئی مری غربت کی داستاں مجھ سے
بھُلایا قصّۂ پیمانِ اوّلیں مَیں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنّت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں مَیں نے
رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں مَیں نے
ملا مزاجِ تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں مَیں نے
نکالا کعبے سے پتھّر کی مورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں مَیں نے
کبھی مَیں ذوقِ تکلّم میں طُور پر پہنچا
چُھپایا نورِ ازل، زیرِ آستیں مَیں نے
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر، چھوڑ کر زمیں مَیں نے
کبھی مَیں غارِ حرا میں چُھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں مَیں نے
سُنایا ہند میں آ کر سرودِ ربّانی
پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں مَیں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سُنی
بسایا خطّۂ جاپان و ملکِ چیں مَیں نے
بنایا ذرّوں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں مَیں نے
لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں مَیں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اسی خیال میں راتیں گزار دیں مَیں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں مَیں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئنہ عقل دُوربیں مَیں نے
کیا اسیر شعاعوں کو، برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں مَیں نے
مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہ نگیں مَیں نے
ہوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں مَیں نے ؎

تاریخ کا مطالعہ، کوئی مشاہدہ اور دینی ارشادات سب درست، مگر ہم نے دیکھا ہے کہ اس نظم کی رُو سے بھی جو، حضرت علامہ کی شاعری کے دورِ آغاز کی نظم ہے، 'رازِ ہستی' جو اس کے بس کی بات نہ تھی، کو خانۂ دل ہی میں مکیں قرار دیا گیا۔

حضرت علامہ ۱۹۰۵ء میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر یورپ تشریف لے گئے۔ انہوں نے کتابوں کے ساتھ ساتھ اُس اہلِ کتاب معاشرے کا تقلیدی اور گرفتار نظر سے نہیں بلکہ تنقیدی اور ہشیار و بیدار نظر سے مطالعہ کیا۔ یورپ کے دورانِ قیام میں ان کی طبیعت ایک اندرونی انقلاب سے دوچار ہوئی جس کا ذکر انہوں نے ایک سے زیادہ بار وحید احمد' مدیر نقیب' بدایوں کے نام تحریر کردہ خطوط میں کیا ہے۔ مثلاً ایک خط میں، جو ستمبر ۱۹۲۱ء کا مؤرخہ ہے اور 'انوارِ اقبال' میں شامل ہے' یوں لکھتے ہیں:

> "حقیقت یہ ہے کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔ یہ ایک طویل داستان ہے۔ کبھی فرصت ہوئی تو اپنے قلب کی تمام سرگزشت قلمبند کروں گا جس سے مجھے یقین (ہے کہ) بہت لوگوں کو فائدہ ہوگا۔" ؎

یہ الگ بات ہے کہ جس طرح ان کے اور کئی قلمی منصوبے پیرایۂ عمل اختیار نہ کر سکے، اسی طرح قلب کی سرگزشت قلمبند کرنے کا منصوبہ بھی منجملہ حسرات ہی رہا ورنہ یورپ سے لوٹنے کے بعد کی شاعری میں جو اچانک تبدیلی کی لہر اُٹھی اور ایسی اُٹھی کہ تادمِ آخر اس کا زور اور جوش کم نہ ہوا، اگر اس کا رُوحانی اور قلبی پس منظر سامنے آ جاتا تو کلامِ اقبال کے مطالب سے لُطف اندوزی اور ایقان پذیری کے

مواقع مزید بڑھ جاتے۔

ہمارے نزدیک اس انقلاب کی آمد آمد کا واضح ترین اعلان وہ اُردو غزل تھی جس کے اُوپر اس کی تصنیف کا سال بھی درج ہے اور مہینہ بھی، یعنی مارچ ۱۹۰۷ء۔ اُردو غزلوں میں بلکہ نظموں میں بھی شاید یہ واحد تحریر ہے جس پر اس اہتمام کے ساتھ ماہ و سالِ تخلیق مرقوم ہے، اور یہ وہی غزل ہے جس میں حضرت علامہ نے ایک طرف یورپ والوں کو متنبہ کیا تھا کہ ان کی تہذیب جلد ہی خود اپنے خنجر سے خودکشی فرمانے والی ہے اور دوسری طرف اہلِ اسلام کو خوشخبری سے نوازا تھا کہ "جو عہد صحرائیوں سے باندھا تھا، وہ استوار" ہونے کو ہے۔ [۱۱]

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر محض یورپ کے معاشرے میں جا بسنے ہی کے باعث حضرت علامہ کے مزاج میں ایک انقلاب رُونما ہو گیا تھا تو درست نہ ہوگا۔ برِعظیم، بلکہ دنیائے اسلام سے جا کے انگلستان یا یورپ کے دوسرے ممالک میں تعلیم حاصل کرنے کی خاطر قیام اختیار کرنے والے ہزاروں مسلمان اور بھی تھے ــــــ سب کا ردِعمل حضرت علامہ جیسا ہرگز نہ تھا۔ اصل میں پائدار اندرونی امنگوں اور بیرونی ماحول کی ناسازگاری کے مابین تصادم کی کیفیت وہ تناؤ اور کھنچاؤ (Tension) کی سی صورت پیدا کر دیتی ہے جو نتیجتہً کسی فکری، علمی، فنی اور شعری تحریک اور تجربے کا روپ دھار لیتی ہے، باہر کا ماحول تو حضرت علامہ کے معاصرین کے لیے تقریباً ایک جیسا تھا، لیکن اندر کی دُنیا مختلف تھی ــــ اور وہ دُنیا حضرت علامہ کے ایمان و عقائد کی دنیا تھی۔ اس اندر کی دنیا میں مسلمان کا غلام ہونا ممکن ہی نہ تھا ؂

بندۂ آزاد را آید گراں
زیستن اندر جہانِ دیگراں [۱۲]

مگر حضرت علامہ نے دیکھا تو یہ کہ تقریباً سارا عالمِ اسلام یورپ والوں کا غلام ہے۔ حضرت علامہ کے اندر کی دنیا میں بنو آدم کے ہر فرد کو اس کی ماں نے آزاد جنا تھا، ہر فرد خلافتِ ارضی کا بالقوۃ مستحق تھا۔ مگر مادہ پرست معاشروں میں انسانی مادی پیاس بڑھانے والے مختلف پیشوں اور رنگا رنگ مشینوں کا ادنیٰ پُرزہ بن کر رہ گیا تھا۔ ایک طرف آدم کی فطری شان اور اس کا استحقاق تھا جو حضرت علامہ کے کوئی مشاہدے کا ایک غیر متزلزل زاویہ نظر تھا، دوسری طرف بنو آدم کی بنو آدم کے ہاتھوں رسوائی اور بربادی کا منظر تھا۔ ایسی فکری اور نظری اوگھٹ گھاٹیاں حضرتِ علامہ کی راہِ حیات میں قدم قدم پر حائل تھیں جن کو سر کرنے کی حضرت علامہ نے شعوری کوشش کی، اور جب ایک بار اس کوشش کا آغاز ہو گیا تو پھر ان کے دمِ آخر تک یہ کوشش آغاز ہی کے ولولے

کے ساتھ جاری رہی۔ اور بے محل نہ ہوگا اس امر کا تذکرہ کہ ارمغانِ حجاز (جو حضرت علامہ کی آخری کتاب ہے اور ان کی وفات کے بعد طبع ہوئی) کا آخری حصہ، جس عنوانِ خیر الختام کا حامل ہے، وہ ہے بحضورِ آدم۔

ہاں تو حضرت علامہ نے اس اندرونی انقلاب کی طرف دوسری گول میز کانفرنس کے زمانے میں بھی تذکرہ کیا یعنی ۱۹۳۱ء کے اواخر میں —— ہُوا یوں کہ کیمبرج یونیورسٹی کے طلبہ کی یونین نے انہیں چائے پر مدعو کیا۔ وہاں حضرت علامہ نے اپنی گفتگو کے دوران نوجوانوں کو نصیحت کی کہ وہ دہریت اور مادیت سے محفوظ رہیں، انہوں نے اپنے اس بیان کی وضاحت کے طور پر فرمایا کہ اہلِ یورپ کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ انہوں نے مذہب و حکومت کو علیحدہ علیحدہ کر دیا۔ اس طرح ان کی تہذیب، اخلاق سے محروم ہوگئی اور اس کا رُخ دہریانہ مادیت کی طرف پھر گیا۔ اس موقع پر انہوں نے ۱۹۰۷ء میں اپنے قلب و روح کے نہاں خانوں کو اضطراب آشنا کرنے والی کیفیت کا بھی ذکر کیا:

> "میں نے آج سے پچیس برس پیشتر اس تہذیب کی یہ خرابیاں دیکھی تھیں تو اس کے انجام سے متعلق پیش گوئیاں کی تھیں، میری زبان پر وہ پیشگوئیاں جاری ہوگئیں، اگرچہ میں خود بھی ان کا مطلب نہیں سمجھتا تھا —— یہ ۱۹۰۷ء کی بات ہے۔ اس سے چھ سات سال بعد ۱۹۱۴ء میں میری یہ پیشگوئیاں حرف بہ حرف پوری ہو گئیں۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ یورپ دراصل اہلِ یورپ کی اسی غلطی کا نتیجہ تھی جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، یعنی مذہب و حکومت کی علیحدگی اور دہریانہ مادیت کا ظہور —— بالشوزم، مذہب و حکومت کی علیحدگی کا ایک طبعی نتیجہ ہے، میں نوجوانوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ مادیت سے بچیں، چند روز قبل انگریز خواتین کے ایک بہت بڑے مجمع میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں عورتوں کو کوئی نصیحت کروں۔ میں نے انہیں کہا تھا کہ انگریز خواتین کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ آئندہ نسل کو دہریانہ مادیت کے چنگل سے محفوظ رکھیں۔ مذہب بے حد ضروری چیز ہے۔ مذہب عرفان و ایقان کا نام ہے۔" [۱۳]

واضح ہے کہ یہ ہمدردانہ نصیحت پانے جن مرد و زن کی خدمت میں پیش کیے جا رہے تھے، اُن کی اکثریت غیر مسلموں پر مبنی تھی۔ مراد یہ کہ حضرت علامہ کا مسئلہ، عُقدہ اور معمّا پوری اولادِ آدم سے

متعلق تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اولادِ آدم (بشمولِ اُمّتِ مسلمہ) کے مسائل و مصائب کا حل اُن سنہری اصولوں میں مہیا پاتے تھے جن کا معروف عنوان "اسلام" ہے، جیسا کہ آگے چل کر بیان ہو گا، انشاء اللہ!

بہرحال، بات ہو رہی تھی حضرت علامہ کے قیامِ یورپ کے بارے میں، تو جس زمانے میں حضرت علامہ یورپ میں مقیم تھے، وہ اس زمانے کے ادبیاتِ مشرق و مغرب کے متن و مواد سے مطمئن نہ تھے۔ ان کے نزدیک مغرب کے ادب میں پھر کچھ جان تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم مغربی ادب کے شعبہ، شاعری کے ذیل میں 'ہربرٹ ریڈ' کی رائے سے آگاہ ہو چکے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ ہربرٹ ریڈ اُس دور کے مشرقی ادبیات خصوصاً شاعری کے کوائف سے یقیناً ناآگاہ تھا ——— حضرت علامہ کی نظر میں مشرقی ادب گویا مغربی ادب کے مقابل زیادہ بے جان تھا۔ اس باب میں حضرت علامہ کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

> "۱۹۰۵ء میں جب مَیں انگلستان آیا تھا تو مَیں محسوس کر چکا تھا کہ مشرقی ادبیات اپنی ظاہری دلفریبیوں اور دلکشیوں کے باوجود اُس رُوح سے خالی ہیں جو انسانوں کے لیے امید، ہمت اور جراُتِ عمل کا پیغام ہوتی ہے، اور جسے زندگی کے جوش اور ولولے سے تعبیر کرنا چاہیے۔ یہاں پہنچ کر یورپی ادبیات پر نظر ڈالی، وہ اگرچہ ہمت افروز نظر آئیں لیکن ان کے مقابلے میں سائنس کھڑی تھی جو ان کو افسردہ بنا رہی تھی۔ اور ۱۹۰۸ء میں انگلستان سے واپس گیا تو میرے نزدیک یورپی ادبیات کی حیثیت بھی تقریباً وہی تھی جو مشرقی ادبیات کی تھی۔ ان حالات میں میرے دل میں کشمکش شروع ہوئی کہ ان ادبیات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرنی چاہیے اور ان میں رُوح پیدا کرنے کے لیے کوئی نیا سرمایۂ حیات فراہم کرنا چاہیے ——— مَیں اپنے وطن گیا تو یہ کشمکش میرے دل میں جاری تھی اور مَیں اس میں اِس درجہ منہمک تھا کہ دو تین سال تک میرے عزیز دوستوں کو بھی علم نہ تھا کہ مَیں کیا کر رہا ہوں۔ ۱۹۱۰ء میں میری اندرونی کشمکش کا ایک حد تک خاتمہ ہوا، اور مَیں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے خیالات ظاہر کر دینے چاہییں۔ لیکن اندیشہ تھا کہ اس سے غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ بہرحال، مَیں نے ۱۹۱۰ء میں اپنے خیالات کو مدِ نظر رکھ کر اپنی مثنوی "اسرارِ خودی" لکھنی شروع کی۔ [۱۲]

مثنوی اسرارِ خودی ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ اس مثنوی میں بنو آدم کو اُن کے مقام سے آگاہ کرنے کی کوشش عمل میں آئی۔ اور عیاں ہے کہ یہ کوشش اُمّتِ مسلمہ کے ایک فرد کی جانب سے عمل میں آئی ــــ اس میں کوئی اچوبہ نہیں، تضاد نہیں، اس لیے کہ حضرت علامہ کی نظر میں دینِ اسلام کسی خاص علاقائی اور لسانی، لونی یا نسلی معاشرے کے لیے نہ تھا۔ دینِ اسلام چند موٹے موٹے بنیادی اصولوں کا نام ہے جن کو ہر رنگ کے معاشرے کا ہر فرد قبول کر کے ایک بین الاقوامی اور بین الانسانی اخوّتِ رُوحانی میں شامل ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حضرت علامہ کا پیغام یا فریاد یا للکار ساری اولادِ آدم کی صلاح و فلاح کے لیے ہے، اور اسلام ہی کے روشن اصولوں پر یہ پیغام، فریاد یا للکار مبنی ہے۔ حضرت علامہ نے 'اسرارِ خودی' کے ابتدائی صفحات ہی میں اس حقیقت کا اظہار کر دیا تھا ؎

بود نقشِ ہستیم انگارۂ
ناقبولے ناکسے ناکارۂ
عشق سوہاں زد مرا آدم شدم
عالمِ کیف و کمِ عالم شدم
بہرِ انساں چشمِ من شبہا گریست
تا دریدم پردۂ اسرارِ زیست
از درونِ کارگاہِ ممکنات
برکشیدم سرِّ تقویمِ حیات
من کہ ایں شب را چو مہ آراستم
گردِ پائے ملّتِ بیضاستم [۵۱]

'میری ہستی ایک نقشِ ناتمام تھی۔ نامقبول، بے کار، بے تشخّص۔ یقین و اخلاص کی برکت سے مَیں آدم بن گیا اور اس طرح دنیا و جہاں کے کوائف و احوال سے آگاہ ہُوا۔ مَیں نے نوعِ انسانی کے لیے روتے، راتیں بسر کر دیں اور پھر ایک مرحلہ آگیا کہ مَیں نے زندگی کے پردۂ اسرار کو چاک کر ڈالا۔ مَیں نے اس کارگاہِ عالم میں، جہاں امکانات، حقائق میں تشکیل پاتے رہتے ہیں، زندگی کی تقویم یعنی قوّت و توازن اور بقا کے بھید ڈھونڈ نکالے۔ مَیں کہ

جس نے رات کو چاند کے انداز میں سنوارا ہے، ملّتِ اسلامیہ کی خاکِ پا ہوں (مراد ہے ایک ادنیٰ مسافرِ مسلم ہُوں)۔"

حضرت علامہ پر ان کی زندگی میں بھی اور ان کی وفات کے بعد بھی ایک اعتراض یہ وارد کیا جاتا رہا ہے کہ وہ فقط اُمّتِ مسلمہ کو اپنا مخاطب جانتے ہیں۔ کوئی ایسا ہی اعتراض تھا جس کے جواب میں حضرت علامہ نے ۱۴ نومبر ۱۹۲۳ء کے مؤرخہ ایک خط میں بطورِ وضاحت فرمایا:

"دوسرے اعتراض کے متعلق یہ بھی عرض ہے کہ میرے نزدیک اسلام نوعِ انسانی کی اقوام کو جغرافی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل اور قومیت سے معنوعی، مگر ارتقائے انسانی کے ابتدائی مراحل میں مفید، امتیازات کو مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے، اسی لیے اسلام اَور مذاہب (بدھ ازم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا۔ چونکہ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لہر یورپ سے ایشیا آ رہی ہے، اور میرے نزدیک انسان کے لیے یہ ایک بہت بڑی لعنت ہے اس واسطے بنی نوعِ انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتے ہُوئے، اس وقت اسلام کے اصلی حقائق اور اس کے حقیقی پیشِ نہاد پر زور دینا نہایت ضروری ہے، یہی وجہ ہے کہ میں خالص اسلامی نقطۂ خیال کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھتا ہوں۔ ابتدا میں مَیں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ھندوستانی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے مَیں نے دیکھا، لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی پیدا کر دی ——— آپ Pan Islam کو ایک پولیٹکل یا قومی تحریک تصوّر کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک طریق چند اقوامِ انسانی کو جمع کرنے اور ان کو ایک مرکز پر لانے کا ہے، اس غرض سے ایک مرکزِ شہودی پر مجتمع ہونے اور ایک ہی قسم کے خیالات رکھنے اور سوچنے کے باعث یہ اقوام نسلی، قومی اور ملکی امتیازات و تعصبات کی لعنت سے آزاد ہو جائیں گی۔ پس اسلام ایک قدم ہے نوعِ انسانی کے اتحاد کی طرف۔ یہ ایک سوشل نظام ہے جو حریّت و مساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے ——— اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے کہ اس وقت

اقوامِ انسانی کے لیے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے۔ اور جو شخص
مسلمان کہلاتا ہے، اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ
خالصتاً للّٰہ اپنی زندگی میں ایک عملی انقلاب پیدا کرے، اور اگر دماغی
قوت رکھتا ہے تو اپنی بساط کے مطابق اسلام کے سمجھنے اور سمجھانے
کی کوشش کرے تاکہ نوعِ انسانی قدیم توہمات سے نجات پائے؟ ۶ا

'برکشیدم سِرّ تقویمِ حیات' سے حضرت علامہ نے، ایک فردِ مسلم کے بطور، بجالیاتِ آدم کے امرِ مُہتم میں خوب خوب کام لیا۔ آدم کی کون سی حیثیت اس کی شان کے شایاں ہے، یہ مسئلہ حضرتِ علامہ کے چند اہم مسائل میں سے ایک ہے۔ 'تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ' کا آغاز ہی اس امرِ مُہتم کی یاددہانی سے ہوتا ہے:

"یہ عالم جس میں ہم رہتے ہیں، اس کی نوعیت کیا ہے اور ترکیب کیا ہے۔
کیا اس کی ساخت میں کوئی دوامی عنصر موجود ہے، ہمیں اس سے کیا تعلق
ہے اور ہمارا اس میں کیا مقام ہے۔ باعتبار اُس مقام کے ہمارا طرزِ عمل
کیا ہونا چاہیے۔"

ہمارا اس عالم سے کیا تعلق ہے، ہمارا اس میں کیا مقام ہے اور باعتبار اس مقام کے ہمارا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے، اس 'چاہیے' سے صاف ظاہر ہے کہ افرادِ اولادِ آدم ازخود تو ذات یا شخصیت بنے بنائے، کاملاً، مشخص، اور شخصاً کامل تشریف نہیں لاتے۔ انہیں اپنے ممکنات کو خود اپنے عزم و ارادہ اور محنت و مشقت سے بروئے کار لانا ہوتا ہے۔ افرادِ اولادِ آدم اس عالم میں جس درجے اور مقام کے بالقوہ مالک ہیں، اس درجے اور مقام تک پہنچنے کے لیے اس مقام اور درجے تک کتنی درجات و مقامات چھوڑنا پڑتے ہیں۔ شخصیت کا ارادی ارتقا، ہر عبور شدہ مرحلے سے قبل کے عناصر کو، جو اُس وقت درکار تھے مگر بعدہٗ زائد اور غیر ضروری ہو گئے، چھانٹ دیتا ہے۔ گویا شخصیت اس طرح پروان چڑھتی ہے کہ زوال اندر حلت یاب اور مطلوب کا مرحلہ بہ مرحلہ اکتساب۔ بقول حضرت علامہ اقبال:

"We become by ceasing to be what we are. Life is a passage through a series of deaths." ۱۷

آدمی کے وجود میں لاکھوں خلیے روز وجود میں آتے ہیں اور لاکھوں خلیے روز مرتے ہیں۔ ہر لحظہ ایک انقلاب اور ہلچل۔ مگر خود آدمی کو خبر نہیں ہوتی کہ اس کے اندر کیا قیامتیں بپا ہیں ـــــ تاہم یہ جسم کی بات ہے جو ایک مرکزی، ملموس Tangible وجود رکھتا ہے ـــــ اور واضح ہے کہ فردِ آدم فقط

جسم ہی نہیں، اس کا دوسرا پہلو روحانی، عقلی، شعوری، ذوقی، ذہنی، فکری، جذبی اور حیوانی بھی ہے۔ وہاں بھی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔ کتنی عقیدے کہ جان کی طرح عزیز محسوس ہوتے ہیں، ہمہ وقت غیر محسوس طور پر اہمیت کھونے لگتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ کتنی جذباتی اور اُنسی لگاوٹیں ہوتی ہیں جو تذبذب احوال ہو کر رحلت فرما جاتی ہیں۔ کتنی تمنائیں ایسی محبوب ہوتی ہیں کہ ہر تمنا پہ دم نکلے۔ مگر پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ وہ تمنائیں صرف غیر محبوب ہو کر ہی نہیں رہ جاتیں بلکہ مضحکہ خیز نظر آنے لگتی ہیں حتیٰ کہ ہم یہ سوچنے لگتے ہیں کہ اگر خدانخواستہ وہ تمنائیں بر آتیں تو اپنا بیڑا ہو گیا ہوتا، اور کبھی کبھی اپنی دعاؤں کی حقیقت پر ہنسی بھی آتی ہے کہ سبحان اللہ ہم کس شوق کی تکمیل میں راتوں کو رو رو کر اللہ کے حضور دعائیں عرض کرتے تھے ——— غرض کتنی اعتمادات مشکوک ہو کر ناپید ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ نئے اعتقادات وارد ہونے لگتے ہیں ——— خانۂ وجود، وجوداً ایک ہی تھا لیکن کن کن انقلابات سے دوچار ہوتا رہا، مگر بہر حال منزل بہ منزل بڑھتا رہا۔ کیا کیا جھڑتا رہا، اور کیا کیا کچھ آکے شامل ہوتا رہا!

"Life is a passage through a series of deaths."

اور پھر ظاہر ہے کہ فردِ خود آگاہ کا شعور بستہ لیت اس کے فکری و جذبی وجود میں شعوری تبدیلیاں پیدا کرتا چلا جاتا ہے۔ یوں اس کا تعقّل، ضمیر اور وجدان بزبانِ اقبال اس کو یہ پیغام سناتا ہے ؎

تری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری
مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے! [۳۱]

آرزو بدل جانے، مراد ہے آرزو بہتر سے بہتر ہوتی چلی جائے۔ لیکن معاشرے میں وہ افراد کتنے فیصد پائے جاتے ہیں جو واقعی اچھے اور بُرے میں تمیز کرنے پر قادر ہوتے ہیں، اور بالخصوص وہ کتنے ہوتے ہیں جو عزم و ارادہ سے کام لے کر غلط جذب و کشش کا جواب ثبات و دفاع کی صورت میں دیتے ہیں؛ یہ عیاں ہے کہ غالب اکثریت نیک و بد میں تمیز روا رکھنے کی اہل ہونے کے باوصف اپنے روحانی پہلو کا، اپنے حیوانی پہلو کے حضور میں، سرِ تسلیم خم کر دیتی ہے اور کیے رکھتی ہے۔ گو روحانی پہلو شعوراً جبلّی، مادّی اور ہوسی تقاضوں کی بے لگامی کو روکتا ہے اور توازن و اعتدال کی راہ دکھاتا ہے ——— اور بالعکس پھر جس نے جبلّی، مادّی اور ہوسی تقاضے کی بے لگامی کے مقابل ہتھیار ڈال دیے، وہ نیچے کی طرف کھسکتا اور پھسلتا چلا گیا۔ Canon Peler Green نے اس صورتِ حال پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

"But since actions affect character, a man who steadily selects the best and noblest of many

competing courses will develop in time a nobler character while the man who selects always the low and base course out of several alternative ones will develop a base character. And this agrees with our daily experience. So to the man who seeks to excuse his faults by saying "If God made me, He, not I, is responsible for my faults," we may truly reply, "But God did not make you. He placed in your hands the power to make yourself. This doctrine that man is in truth a self-creating being is of the greatest possible importance alike in life and in ethical theory." [۱۹]

مراد یہ کہ آدمی خود پرداز اور خود اختیار ہے، چاہے تو ایسا رویہ اختیار کرے جو اسے بلندیوں کی طرف لے جائے اور چاہے تو وہ رویہ اختیار کرے جو اسے پستیوں کی طرف دھکیل دے۔ آدمی میں یہ اختیار استعمال کرنے کی اہلیت موجود ہے۔ اس میں فرمان پذیری کی قابلیت بھی موجود ہے اور نافرمانی کی بھی، مگر آغازِ کار میں اس کی خلقت پر مادّی عنصر غالب رہتا ہے[۲۰]، رفتہ رفتہ روحانی پہلو بیدار ہونے لگتا ہے اور تعقّل کا جوہر اپنے کام میں لگ جاتا ہے۔ صوفیہ نے اپنے وجودِ مادّی کو عالمِ خلق قرار دیا ہے اور روحانی پہلو کو عالمِ امر۔ پھر شعور و تعقّل کی بلوغت سے متناسب عالمِ خلق اور عالمِ امر کے مابین کشمکش شروع ہو جاتی ہے۔ اب ہر وہ فرد جس نے عزم و ارادہ کے ساتھ عالمِ امر کو عالمِ خلق پر حاوی کر لیا، وہ اصل فطرتِ آدمیت کی طرف لوٹنے اور اسے پالینے کے قابل ہو گیا۔ اس کے برعکس جس نے اپنے روحانی پہلو کو غفلت کی نذر کر دیا، وہ عالمِ خلق یعنی مادّی حیوانی پہلو کا اسیر و بندہ ہو کر رہ گیا اور اس کا سفر پستی کی جانب جاری رہا۔ اور آخر ایک مرحلہ ایسا بھی آیا کہ روحانی اور حیوانی پہلو کے مابین کشمکش ختم ہو گئی اور حیوانی پہلو پوری طرح قابض ہو گیا۔ لہٰذا آدمی بڑی بے نیازی کے ساتھ جسم ہی کے جبلّی احکام پورے کرنے میں لذّت محسوس کرتا رہا۔ ایسے ہر آدمی کے لیے پھر یہ مسئلہ کوئی مسئلہ ہی نہیں رہ جاتا کہ وہ آدمی ہے اور آدمی کی حیثیت سے اسے کون و مکان میں کوئی مقام حاصل ہے اور اسے اپنے آپ کو اس مقام کا اہل ثابت کرنا ہے۔ حضرت علامہ کا مشہور قطعہ ہے:

دمے چوں صحبتِ گِل می پذیرد
بماند م لذّتِ خوابش بگیرد
شود بیدار چوں 'من' آفرینند
چو 'من' محکومِ تن گردد بمیرد ۲۱

جوہرِ آدمیت سے محروم فرد ضروری نہیں کہ جنگلی، بدوی، ناخواندہ اور آداب سے ناآگاہ ہو —— نہیں، وہ بڑا بارعب اور مہذّب بھی نظر آسکتا ہے۔ وہ عالم و فاضل بھی ہو سکتا ہے۔ وہ استاد، وکیل، معالج، صنعت کار، خلا باز، سائنسدان اور اعلیٰ درجے کا کمانڈر و حکمران بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کا واعظ اور ذاکر بھی ہو سکتا ہے —— وہ اپنے خاص شعبے میں بڑا نامی گرامی، اخباری اور اشتہاری بھی ہو سکتا ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ اسے یہ بھی خیال ہو یا یاد رہے کہ اسے اس سب کچھ کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سب کچھ سے بڑھ کر آدمی بھی بننا اور رہنا ہے۔ اس کی تعلیم میں تعلیمِ آدمیت اور تربیتِ انسانیت قسم کی کوئی شے شامل ہی نہیں۔ بریفالٹ کے بقول ؎

It is reasonable and right that every man should with all available knowledge and training be fitted for the particular work he is intended to perform; but that is not the first object of education. It is not in the proper sense education at all. The carpenter should be trained in carpentering, the doctor in medical science, the farmer in agriculture. But a man besides being a carpenter, a doctor, or a farmer, is first and foremost a man. In addition to carpentering, or doctoring, or farming, in addition to having to deal with the problems of materials and construction, or of pathology, or of the chemistry of soils, he is confronted with the problems of life, with the problems of the living world. In addition to being a working member in the division of the world's labour, he is a living mind. ۲۲

آدمی بہت کچھ جاننا چاہتا ہے، بہت کچھ بننا چاہتا ہے مگر اپنی اساسی حیثیت کی شناخت کا اسے کبھی خیال نہیں آتا۔ وہ کیا جوہر ہے جس کی بدولت وہ صحیح مقام آدمیت پر فائز ہو سکتا ہے، وہ اپنا علم سے معصوم ہے ـــــ مادی دولت کے درجات، فنی درجات، منصبی درجات، سیاسی درجات اپنی جگہ بجا، آدمی ہر باب میں بظاہر کامیاب، مگر اس سب کچھ کے باوجود وہ پہلو اس کے سامنے نہیں آتا جو آدم کو ان جملہ درجات سے فائق بنائے۔ اگر آدمی اپنی شان اور حیثیت سے واقف نہیں تو پھر وہ اپنے مال کا غلام ہے، اپنی جاہ کا مملوک ہے، اپنے منصب کا بندہ ہے، اپنی کرسی کا چپڑاسی ہے، اپنے فن کا رکابدار ہے اور اپنے علم کا چلم بردار۔ یہ سب کچھ زیادہ سے زیادہ آرائشی اور تزئینی، مگر انفکاک پذیر متعلقات ہیں۔

آدمی وہ عالی سرکار ہے جسے چاہیے کہ اپنے اکتساب کو اللہ کی دین مانے اور جو جب تک اللہ کا دیا میسر ہے، اس کا خود کو حاکم، سلطان اور والی سمجھے چہ جائیکہ اپنی ملکیت کی مملوکیت میں مبتلا ہو جائے فائق وہ ہے، متصرف وہ ہے ـــــ دنیا جہاں میں جو کچھ ہے، اس کے لیے ہے نہ کہ برعکس۔ حضرت علامہ نے بجا ہی تو فرمایا تھا ؎

نہ تو زمیں کے لیے ہے، نہ آسماں کے لیے
جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے ۲۳

اور اسی ناآگاہی سے آدم کو آگاہ کرنے کی خاطر مزید فرمایا ؎

اندکے اندر جہانِ دل نگر
تا زنورِ خود شوی روشن بصر ۲۴

بینی جہاں را، خود را نہ بینی
تا چند ناداں غافل نشینی ؟
نورِ قدیمی شب را بر افروز
دستِ کلیمی در آستینی !
بیروں قدم نہ از دورِ آفاق
تو پیش ازینی تو بیش ازینی ۲۵

"تو دنیا کا جائزہ تو لیتا ہے مگر خود اپنا مشاہدہ نہیں کرتا۔ اے نادان! تو کب تک غافل رہے گا؟ تو نورِ قدیم ہے، نورِ ازل ہے، تو دنیا کی تاریکیوں کو روشنی میں بدل دے۔ تو ید بیضا ہے مگر اپنی آستین میں چھپا ہوا ہے۔ آفاقی حدود سے قدم باہر رکھ،

تُو ان حدود کا قیدی نہیں۔ تُو ان حدود سے آگے نکل جا۔ تو جہان کے وجود میں
آنے سے قبل بھی تھا، تو اس جہان سے گراں بہا ہے اور وسیع تر ہے۔"

حضرت علامہ نے آدمی کو "نورِ قدیم" قرار دیا ہے۔ مراد ہے کہ ہستی آدم میں نورِ ازل کا پرتو موجود ہے۔ یہ اشارہ ہے ان کلماتِ خداوندی کی طرف:

"وَ نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي"

حضرت علامہ آدمی کی روح کو پارۂ نور جانتے ہیں، اور یہی آدم کا مایۂ فضیلت ہے۔ کون و مکاں کی کسی دوسری مخلوق کے بارے میں خدا تعالیٰ نے ایسا نہیں فرمایا۔ خلاقِ کون و مکاں نے فرشتوں کو حکم دیا:

"فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَ نَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ ه" [۲۶]

"اور جب میں اسے ٹھیک ٹھیک ڈھال دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو اس دم تم اس کے لیے سرِ تسلیم خم کر دینا!"

یہاں توجہ طلب کلمہ "رُوحی" میری روح، اپنی روح ہے۔ یعنی خداوندِ کریم نے روح کو متکلم کے صیغے کے ساتھ حاضر کر دیا ہے،

نفخِ روح کے باب میں محمد اسد (لیوپولڈ) اپنی تفسیر میں کہتے ہیں:

God's breathing of His spirit into man is obviously a metaphor for His endowing him with life and consciousness, that is, with a soul. [۲۷]

مگر یہاں بات "a soul" کی نہیں، یہاں معاملہ روحی یعنی my soul کا ہے۔ درست کہ بیان مجازی ہے مگر نسبت تو خدا کی طرف ہے ــــــ پیر محمد کرم شاہ اس امر کی وضاحت یوں فرماتے ہیں:

"اضافت بعضیت کی نہیں بلکہ تشریف اور عزت افزائی کے لیے ہے۔۔۔۔ اس کی اضافت کی وجہ یہ ہے کہ تجلیاتِ رحمانیہ کے قبول کرنے کی صلاحیت صرف اس میں پائی جاتی ہے کیونکہ یہ روح، عالمِ خلق اور عالمِ امر دونوں کی خصوصیات کی جامع ہے، اسی لیے اسے خلافت کا مستحق قرار دیا گیا۔" [۲۸]

پیر صاحب کے پیشِ نظر مفہوم یہ ہے کہ خالقِ دو جہاں نے آدم کی شان اور عزت بڑھانے کے لیے "مِن رُّوحِي" کا پیرایۂ بیان اختیار کیا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود کوئی اپنا حصہ یا ہستیِ مطلق کا کوئی پارہ آدم میں منتقل کر دیا ہو ــــــ تاہم وہ کوئی شے نوری سی ہے ورنہ اس میں تجلیاتِ رحمانیہ کو قبول کرنے کی

اہلیت وصلاحیت کہاں سے آتی۔

پیر غلام دارث مرحوم عموماً حضرت طنطاوی کا اتباع کرتے ہیں۔ وہ اس نکتے کی تشریح بالفاظ ذیل کرتے ہیں:

"روح کی نسبت اپنی طرف کرنے سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کوئی جزو انسان میں داخل یا شامل کر دیا ہو بلکہ مقصود تشبیل و تکریم ہے، یعنی میں نے اس میں ایسی روح (جان) ڈالی ہے جس کو میرے ساتھ خاص نسبت اور قریبی تعلق ہے، اس کو میں نے اپنا مظہر (نائب) بنا کر ایک حد تک تصرف و اختیار، علم اور تخلیقی قوت دی ہے۔ گویا اس لفظ سے انسان کے شرف کا اظہار کرنا مقصود تھا۔ (آدم کو) یہ (فرشتوں کا) سجدہ خلافتِ الٰہیہ کے نشان کے طور پر تھا۔ گویا دنیا کی تمام طاقتیں بنی آدم کی مطیع ہوں گی اور خود انسان، اللہ کے آگے سر بسجود رہے گا۔" [۲۹]

حضرت شاہ ولی اللہ روح کی اس لطیف حقیقت کو ایک 'نورانی نقطہ' اور عالمِ قدس کا ایک روزن قرار دیتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب ہی کے الفاظ میں:

"اس کو ابتداءً روحِ ہوائی سے تعلق ہے اور ثانیاً بدن سے کہ روحِ ہوائی سے مرکب ہے۔ وہ عالمِ قدس کا ایک روزن ہے۔ جب روحِ ہوائی میں قابلیت اور استعداد پیدا ہو جاتی ہے تو اس وقت روحِ سماوی کا اس پر نزول ہوتا ہے۔" [۳۰]

حضرت علامہ بھی انسانی جوہرِ حیات کو نوری نقطہ ہی قرار دیتے ہیں ؎

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است
زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است [۳۱]

جوہرِ نوریست اندر خاکِ تو
یک شعاعش جلوۂ ادراکِ تو [۳۲]

بہرحال، ابلیس کے سوا سب فرشتوں نے سرِ تسلیم، آدم کے حضور میں خم کر دیا اور ابلیس کو اگر دلیل ملی تو یہ کہ:

خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ

ابلیس کے اس موقف کو حضرت علامہ بالفاظِ ذیل بیان کرتے ہیں ؎

نوریِ ناداں نیم سجدہ بآدم برم !
اُو بہ نہاد است خاک، من بہ نژاد آذرم ! [۳۳]

عدولِ حکم اپنی جگہ، مگر دلیل کا اس امر پر زور کہ آدم خاک سے پیدا ہوا، اس اعتبار سے کمزور تھا کہ ابلیس "نفخِ رُوح" کی حقیقت کو سمجھنے سے قاصر رہا۔ بجا کہ وجودِ آدم کا ظاہری پیکرِ خاک سے تشکیل یاب ہُوا، مگر دوسرا پہلو جو ممکنات و قابلیات کا پہلو تھا، اُس کی عظمتوں سے ابلیس آگاہ نہ تھا۔ پروفیسر عبداللہ یوسف علی اس امر پہ روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"The origin of evil is arrogance and jealousy on the part of Satan who saw only the lower side of man (his clay) and failed to see the higher side, the faculty brought in by the spirit of God." [۳۴]

ظاہر ہے کہ وہی وجود جو "احسنِ تقویم" کا مضمون اور "نَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُّوحِي" کی تفسیر تھا صفاتِ الٰہیہ سے پرتو پذیر ہونے کے قابل اور اہل تھا۔ حضرت علامہ کے الفاظ میں ؎

ترا جوہر ہے نوری، پاک ہے تُو
فروغِ دیدۂ افلاک ہے تُو
ترے صیدِ زبوں افرشتہ و حُور
کہ شاہینِ شہِ لولاکؐ ہے تُو [۳۵]

اور پھر جس کی اہمیت یہ تھی، وہی زمین پر خلیفۂ خداوندی بھی ہو سکتا ہے، چنانچہ اسی کے حق میں خلّاقِ کون و مکاں نے "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" کا اعلان فرمایا تھا۔ کلمۂ خلیفہ کی وضاحت کرتے ہوئے، اور مفسرین سلف کے حوالے سے مولانا عبدالماجد دریا بادی رقمطراز ہیں:

"خلیفہ اسے کہتے ہیں جو کسی کی نیابت کرے، اور خلیفۃ اللہ وہ ہے جو زمین پر اللہ کی شریعت کی حکومت قائم کرے، یخلفنی فی الحکم بین خلقی و ذلک الخلیفۃ ھو آدم من قام مقامہ فی طاعۃ اللہ والحکم بالعدل بین خلقہ (ابن جریرؒ، ابن عباسؓ، ابن مسعودؓ) ——— خلیفۃ اللہ فی ارضہ لاقامۃ احکامہ و تنفیذ قضایاہ (معالم) یہیں سے ظاہر ہو گیا کہ انسان کو جو قوٰی ملیں گے، وہ اس غایت و مقصود یعنی منصب

خلافتِ الٰہی کے مناسب سے ملیں گے۔ نسلِ انسانی خود اپنی اصلاح و فلاح
کے لیے اس کی محتاج تھی، اور محتاج ہے کہ کسی اپنے ہم جنس کے واسطے
سے شریعتِ الٰہی سے استفادہ کرے، اور سلسلۂ نبوت اسی واسطے قائم
ہُوا۔ واضح رہے کہ دنیا کے کسی مذہب نے انسان اور نوعِ انسان کو اس
بلند مرتبے یعنی خلافت و نیابتِ الٰہی پر نہیں رکھا۔" [۳۶]

مگر "إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" کے اعلان خداوندی کو سن کر فرشتوں نے التماس کی تھی کہ ایسے وجود کو لباسِ ظہور عطا ہو رہا ہے جو دنیا میں خونریزی کا مرتکب ہو گا۔ ساتھ ہی فرشتوں نے یہ بھی عرض کیا کہ جہاں تک تسبیح و تقدیس کا تعلق ہے، ان کا اپنا (فرشتوں کا) وجود کافی تھا۔ جواب خداوندی تھا "انی أعلم ما لا تعلمون" [۳۷] "میں وہ کچھ جانتا ہوں جو کچھ تم نہیں جانتے۔" چنانچہ پہلا مرحلہ اسمائے اشیاء ہی کا آگیا، اللہ تعالیٰ نے آدم کو جملہ اشیاء کے علم سے نواز دیا تھا ——— پھر فرشتوں کو جلوۂ اشیاء دکھا کر پوچھا

"أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ" [۳۸]

——— اگر تم ٹھیک کہتے ہو تو ذرا ان اشیاء کے اسماء مجھے بتاؤ ——— مطلب واضح تھا کہ جس کو دنیا میں میرا نائب بن کر رہنا ہے، وہ اس دنیا کو مسخر کرنے کے قابل ہونا چاہیے اور تسخیر کے لیے لازم ہے کہ جملہ اشیاء کی اصلیت و ماہیت سے آگاہی میسر ہو۔ بالفاظ علامہ اقبال ؒ

علمِ اسماء اعتبارِ آدم است
حکمتِ اشیاء حصارِ آدم است [۳۹]

مولانا عبدالماجد دریابادی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"یعنی آدم کو اشیائے کائنات کے اسماء و آثار اور خواص کا علم دے دیا۔"

علامہ راغب اصفہانی کہتے ہیں:

"الاسم ما یعرف به ذات الشیء"

اسم سے مراد ہے وہ کلمہ جس کے ذریعے کسی شے کی ذات، حقیقت، اصلیت اور خاصیت معلوم کی جا سکے۔ فرشتوں کا جواب تھا:

سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ ۝ قَالَ
يَا آدَمُ أَنْبِئْهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ ۖ فَلَمَّا أَنْبَأَهُمْ بِأَسْمَائِهِمْ قَالَ أَلَمْ أَقُلْ لَكُمْ
إِنِّي أَعْلَمُ غَيْبَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَأَعْلَمُ مَا تُبْدُونَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۝ [۴۰]

"وہ بولے تو پاک ذات ہے۔ ہمیں تو کچھ علم نہیں۔ ہاں، مگر وہی جس کا علم تو نے ہمیں عطا کیا۔ بیشک تو ہی بڑے علم والا اور حکمت والا ہے ——— (پھر) کہا اللہ نے آدم کو بتلا دو انہیں اِن (چیزوں) کے نام۔ جب آدم نے اشیاء کے نام بتا دیے تو اللہ نے کہا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزوں کو جانتا ہوں، اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، میں سب جانتا ہوں۔"

محولہ بالا آیت کی وضاحت کرتے ہوئے مشہد کے ڈاکٹر علی شریعتی لکھتے ہیں کہ خود اللہ آدم کا معلم ہے، اسی نے آدم کو اسمائے اشیاء سکھاتے تاکہ وہ چیزوں کو ان کے نام سے جان سکے، اسمائے اشیاء کی تعلیم گویا پہلی تعلیم تھی۔ اس طرح آدم کا برتر علم فرشتوں کے مقابل اس کی یکتا فوقیت کا نشان بن گیا۔ یہ برتری اصلی اَسلی نہ تھی[۴۱] ——— اور خواصِ اشیاء سے آگاہی کی بدولت تسخیرِ فطرت کی راہ کھلی ہے مگر یہ بحث "آدم اور تسخیرِ فطرت" کے باب میں عرض کی جائے گی۔ اس ضمن میں مولانا محمود الحسن ؒ فرماتے ہیں:

"اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوئی۔ عبادت میں تو فرشتے آدم سے بڑھے ہوئے تھے مگر چونکہ وہ علم میں انسان سے کم تھے، اس لیے مرتبہ خلافت سے محروم رہے۔ عبادت خاصہ مخلوق ہے۔ خدا کی صفت نہیں۔ علم خدائے تعالیٰ کی صفتِ اعلیٰ ہے اس لیے مستحق خلافت جو آدم ہوئے کیونکہ ہر خلیفہ میں مستخلف منہ کا کمال ہونا ضروری ہے۔"[۴۲]

گویا بندے کے امکانات میں یہ امکان شامل ہے کہ وہ صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہونے کے باب میں ترقی پذیر رہے۔ صفاتِ الٰہیہ کے پرتو کا کائنات میں سب سے بڑا امانت دار وہی ہے۔ ہر امکان بقدرِ بارِ امانت ہے۔ کیا خلیفۃ اللہ ہونے کی اہلیت کا حق امانت ادا ہوا؟ کیا آدم امانت داری کی مسئولیت کو سمجھا بھی؟ حضرت علامہ فرماتے ہیں ؎

مشو غافل کہ تو او را امینی

چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی![۴۳]

پروفیسر غلام دستگیر رشید، نظام کالج حیدر آباد (بھارت) کے الفاظ ہیں:

"عبد ہو کر بھی وہ امین اللہ، خلیفہ اور ولی اللہ ہوتا ہے۔ ایسا عبد کہہ سکتا ہے اَنا عبدک کیونکہ وہ معلوم اللہ، مخلوق اللہ، اور غیر ذات اللہ ہے۔ اور پھر وہ یہ بھی کہہ سکتا ہے فمن رآنی فقد رأ الحق کیونکہ اس میں مظہریت اور رائیت"

حق ہی کی ہے ۔ اسی خیال کو اقبالؔ وضاحت کے ساتھ یوں ادا کرتے ہیں ؎

کرا جوئی، چرا در پیچ و تابی؛
کہ او پیداست تو زیرِ نقابی
تلاشِ او کنی، جز خود نہ بینی!
تلاشِ خود کنی، جز او نیابی! [۴۴]

گویا عبد ہے معیاری اور نصب العینی بندہ، اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا ۔ ارشادِ خداوندی ہے :

"صبغۃ اللہ ومن احسن من اللہ صبغۃ" [۴۵]

"اللہ کا رنگ اختیار کرو، اللہ کے رنگ سے بہتر اور خوشتر رنگ کس کا ہے؟"

اس حکم کا مخاطب فقط انسان ہے ۔ علامہ اقبالؔ اسی خطاب کو اپنے الفاظ میں یوں ڈھالتے اور سمجھاتے ہیں ؎

رنگِ او بر کن مثالِ او شوی
در جہاں عکسِ جمالِ او شوی [۴۶]

مردِ حق از کس نگیرد رنگ و بُو ؎
مردِ حق از حق پذیرد رنگ و بُو [۴۷]

نبیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمودہ مستور ہے :

"تخلقوا باخلاق اللہ"

"اللہ کے اطوار، آداب، اخلاق اپناؤ۔"

اللہ کے رنگ میں رنگے جانا یا اللہ کے اخلاق اپنانا اسی وجود کے لیے ممکن ہے جس میں اس امر سے متطابق اور متناسب اہلیت ہوگی ۔ بنو آدم کے وجود میں یہ امکانات ودیعت شدہ ہیں اور بیان کردہ ہدایت اسی نے دی تھی جس نے یہ اہلیت ودیعت کی تھی ۔ اس سے بڑھ کر تو کیا اس جیسا بھی لطیف و خبیر کون ہے ——— یہ اہلیت جس نے ودیعت کی، اُسی نے یہ بتا بھی دیا :

"فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ
لَا تَبْدِيلَ لِخَلْقِ اللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يَعْلَمُونَ ۝" [۴۸]

"چنانچہ تم یکسو ہو کر دین (اسلام) کی طرف متوجہ رہو، (رُخ اس کی طرف رکھو) اللہ کی اس فطرت کا اتباع کرو جس کے پیرائے پر انسان کو اللہ نے پیدا

کیا، اللہ کی بنائی ہوئی فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں، یہی ہے دین سیدھا اور راست لیکن اکثر لوگ یہ بات بھی نہیں جانتے۔"

اس آیۂ کریمہ میں بڑی اہم بات کہی گئی ہے، ڈاکٹر یوسف حسین خان لکھتے ہیں :

"انسانی فضیلت اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی کہ اس کی فطرت کو فطرتِ الٰہی کے مطابق ٹھہرایا۔" ۴۹

مولانا عبدالماجد دریاآبادی فرماتے ہیں :

"فطرت کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص میں اللہ تعالیٰ نے خلقۃً یہ استعداد رکھی ہے کہ اگر حق کو سُنے تو وہ سمجھ میں آجاتا ہے، اور اس کے اتباع کا مطلب یہ ہے کہ اس استعداد اور قابلیت سے کام لے اور اس کے مقتضا پر کہ ادراکِ حق ہے، عمل کرے ——— یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ یہ دین تو عین فطرتِ انسانی کے مطابق ہے، اور فطرتِ بشری میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں اس لیے اس دین میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔" ۵۰

پروفیسر عبداللہ یوسف علی کی تشریح بھی یہی ہے مگر زیادہ حوصلہ افزا اور دلنشیں ہے :

"As turned out from the creative hard of God man is innocent, pure, true, free, inclined right and virtue and endowed with true understanding about his own position in the universe and about God's goodness, wisdom and power." ۵۱

حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ صداقت نہاد ہے :

"کل مولود یولد علی الفطرۃ حتّٰی یعرب عنہ لسانہ ، فابواہ یہوّدانہ او ینصرانہ أو یمجّسانہ" ۵۲

"پیدا ہونے والا ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے یہاں تک کہ اس کی زبان اُس کا حال بیان کرنے لگے (مراد بولنے کی عمر تک وہ فطرتِ صحیحہ پر رہتا ہے) پھر اس کے والدین اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا ڈالتے ہیں۔"

از روئے فطرت انسان پاک صاف ہے، توحید اس کا فطری ایمان ہے۔ اس لیے کہ اس میں خدائے احد نے اپنے اوصاف و صفات سے پر تو پذیر ہونے کی اہلیت ودیعت کر رکھی ہوتی ہے، وہ طبعاً اور فطرتاً خدا کی طرف کھنچتا ہے۔ صفاتِ الٰہیہ سے پر تو پذیری خدانخواستہ خدا تی کا بندے میں حلول نہیں، للہٰذا اس

عقیدے میں شرک کا خفیف سا بھی شائبہ نہیں پایا جاتا۔ بقول علامہ اقبال ؎

از زبانِ صد شعاعِ آفتاب!
کم نمی گردد متاعِ آفتاب ۳۶؎ (الف)

یہ الگ بات ہے کہ بچہ آگے چل کر والدین کے زیرِ اثر اور قریبی ماحول کی بدولت اصل فطرت سے دور جا پڑے اگر وہ حسبِ فطرت تربیت پائے تو لازماً موحّد کے طور پر پروان چڑھے۔ بالفاظِ دیگر توحید پر قرار آدمی کے اپنی فطرت پر برقرار رہنے کی دلیل ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ فطرت مسخ نہیں ہوتی۔ اور اگر کوئی شخص گمراہ ہو چکنے کے بعد اور کفر و شرک کو اپنا کیش بنا لینے کے بعد توحید کی طرف لوٹے تو گویا اُس نے اپنی اصل فطرت اور طبیعت کی طرف رجوع کر لیا، اور پھر حسبِ بیان علامہ اقبال:

"پھر چونکہ ذاتِ الٰہیہ ہی فی الحقیقت روحانی اساس ہے زندگی کی، لہٰذا اللہ کی اطاعت (خود اپنی) فطرتِ صحیحہ کی اطاعت ہے۔ اسلام کے نزدیک حیات کی یہ روحانی اساس ایک قائم و دائم وجود ہے جسے ہم اختلاف و تغیر میں جلوہ گر دیکھتے ہیں۔" ۳۷؎

اقتباسِ بالا میں دو کلمات یعنی 'خود اپنی' میں نے اضافہ کیے ہیں، اس لیے کہ حضرت علامہ کا انگریزی جملہ یہ ہے:

Loyalty to God virtually amounts to man's loyalty to his own ideal nature.

حضرت سید نذیر نیازی سے ترجمہ کرتے وقت "to his own" کے کلمات صرفِ نظر ہو گئے ——— اطاعتِ خداوندی کا معنیٰ واضح ہے۔ احکامِ خداوندی کے مطابق کاروبارِ حیات میں عمل پیرا ہونا، عبادات سمیت ——— یہی ہے اپنی فطرت کی جانب لوٹنا جس کا مطلب ہے خدا کے رنگ میں رنگے جانا (اور دوسرا معنی خود بخود عیاں ہو گیا کہ جو خدا کا نافرمان ہے، وہ خود اپنی فطرت کی مخالفت پر کاربند ہے) اور یہ وہی حقیقت ہے جس کا مصدر آدم کے وجود میں اللہ کا اپنی رُوح پھونکنا ہے۔ اللہ کی طرف فطری کشش اور ذوقِ عبادت بھی اسی خمیری عنصرِ نُور کی کارفرمائی ہے۔ حضرت علامہ کے الفاظ میں:

Thus you will see that, psychologically speaking, prayer is instinctive in its origin. ۳۸؎

آدمی جب بھی کسی دھندے میں محو و مستغرق ہوتا ہے یا اسے زندگی کے اس شعبے میں بحرانی کیفیت

سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو اس کا اپنا فن یا پیشہ ہے تو عقلی، منطقی، ادراکی، فنی، ہنری اور پیشہ ورانہ اور شعبہ جاتی درجات کی بلندی ہی فقط اس کی نگاہوں میں وا نہیں ہوتی بلکہ وہ ایک وجدانی مرحلہ و فضا میں آجاتا ہے۔ آخر یہ ہے کیا؟ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اگر آدمی کے اندرون میں کوئی ایسی شے موجود نہیں جو مادّی اور حواسی حدود سے بالا اور ماورا ہے تو وہ بحرانی اور استغراقی لمحات میں بے حدود و بے ثغور کیوں ہو جاتا ہے ——— ٹھیک کہا ہے کسی نے کہ ایک جرنیل میں جب وہ دشمن کی پے در پے چالوں سے دوچار ہوتا ہے اور جواباً کامل سرعت کے ساتھ فی البدیہہ چالیں چل رہا ہوتا ہے، اس کی حسابی، کتابی، منطقی دانش سے زیادہ اس کا وجدانی جوہر کارفرما ہوتا ہے۔ آدمی کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی نوری کیفیت پنہاں ہے جو اچانک بیدار ہو کر اسے کسی مافوق الوجود قسم کی ہستی میں ڈھال دیتی ہے کہ خود اسے معلوم نہیں ہوتا، مگر وہ یقیناً ان لمحات میں خود اپنے وجود سے بالا کوئی وجود ہوتا ہے، بعد میں آدمی سوچتا رہ جاتا ہے کہ فلاں بات اس کے ذہن میں آناً فاناً، بے غور و تدبر آ کیسے گئی، فلاں صورتِ حال یا مفہوم اس پر ارتعاشِ برق کی سی تیزی کے ساتھ منکشف ہو کیسے گیا۔ اسی امر کی تشریح کے طور پر اقتباس ذیل درج کیا جاتا ہے:

> "All talents that of a painter, a poet won of a shoe maker, if it raises its possessor above the common level of knowledge and ability is a means to communicating with God and discussing, our private affairs with him." ۵۵

یہ بحرانی لمحہ وجدانی اور قدسی فضا میں لے جا کر آنکھ، کان، زبان، دانش غرض ہر حواسی وسیلے کو اصل سرچشمے تک پہنچا دیتا ہے ——— بقول علامہ اقبال:

ہے ذوقِ تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں
غافل! تو نِرا صاحبِ ادراک نہیں ہے ۵۶

حریمِ ذات ہے اس کا نشیمنِ ابدی
نہ تیرہ خاکِ لحد ہے نہ جلوہ گاہِ صفات ۵۷

یہ اوپر کو کھینچنے کی اہلیت اللہ کی ودیعت کردہ ہے بشرطیکہ ابنِ آدم جان بوجھ کر نیچے کی جانب جانے یا زمین سے چپکے رہنے پر مُصر نہ ہو۔ اس ضمن میں منظر الدین صدیقی کے مقالے "Iqbal's Concept of Evolution" میں مندرج Lloyd Morgan کا بیان دلچسپ مؤید ہے:

Without denying a felt push from the lower

levels of one's being--a so-called driving force welling up from below--to me. it feels like drawing upwards through activity existent at a high level than that to which I have attained. This sounds like Plato's notion of the Deity whom the Greek philosopher conceives of as a magnet pulling all beings towards itself. [۵۰]

عباس محمود العقاد لکھتے ہیں :

"معراج من التراب المجبول الی افق الارواح والعقول"

"یہ جبلی مٹی کا روحوں اور عقلوں کے آخری کنارے تک ایک عروجی سفر ہے۔"

اور وہ ساتھ ہی حوالہ دیتے ہیں اس آیۂ کریمہ کا :

"یا ایّھا الانسان انّک کادح الی ربّک کدحًا فملاقیہ"

"اے انسان تو محنت و مشقت میں جتا رہے گا اور پھر اپنے رب سے جا ملے گا۔"

عباس محمود العقاد تشریحاً

"وانّہ ملاقیہ لانہ مخلوق علی صورتہ کما جاء فی الحدیث النبوّی الشریف۔ مخلوق علی صورۃ الخالق"

آدم خدا سے جا ملے گا اس لیے کہ وہ خلق ہی خدا کے روپ میں ہوا جیسا کہ حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلّم) میں آیا ہے کہ آدم مخلوق ہے صورتِ خالق پر، اور پھر اس حدیث شریف کا مفہوم واضح کرتے ہوئے استاد العقاد لکھتے ہیں کہ اس سے مراد ہے کہ آدم کو خدائے جلّ وعلا کی صفاتِ حُسنیٰ اور عقل اعلیٰ کا روپ دیا گیا ہے۔ [۵۱]

لہٰذا فردِ بیدار دل خاک میں اسیر ہو کر نہیں رہ جاتا اور نہ کائنات میں، جسے علامہ نے جلوۂ صفات کہا ہے، گم ہوتا ہے ــــ وہ اعلیٰ ممکنات کے باعث خاک کی کشش اور قید سے نکل کر او رجہانِ شرق و غرب کی حدود کو عبور کر کے اپنے روحانی مصدر و منبع کی طرف ارتقاء پذیر رہتا ہے۔

اولادِ آدم کے اس طرح اپنے خالق و معبود کی جانب کھنچنے کی حقیقت کو خدائے تعالیٰ نے آیۂ ذیل میں یوں بیان کیا ہے :

"وَاِذْ اَخَذَ رَبُّکَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُھُوْرِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ وَاَشْھَدَھُمْ عَلٰٓی

أَنفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَىٰ شَهِدْنَا أَن تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَٰذَا غَافِلِينَ ۝ أَوْ تَقُولُوا إِنَّمَا أَشْرَكَ آبَاؤُنَا مِن قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّن بَعْدِهِمْ أَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُونَ ۝ [۱۸]

"(اور اس واقعہ کا ذکر کیجیے) جب آپ کے پروردگار نے نکالا اولادِ آدم کی پُشت سے ان کی نسل کو اور انہی کو ان کی جانوں پر گواہ بنایا اور کہا کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہُوں، بولے ضرور ہیں ہم گواہی دیتے ہیں۔ یہ اس لیے ہُوا کہ کہیں تم قیامت کے دن یہ نہ کہنے لگو کہ ہم تو اس امر سے بے خبر تھے یا یوں کہنے لگو کہ شرک تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے قبل کیا تھا، ہم تو ان کے بعد ان کی نسل سے ہوتے، تو کیا تُو ہمیں ہلاک کر دے گا (اصل) اہلِ باطل کے کرتوت پر"؟

ان آیات کے حوالے سے پیر غلام وارث لکھتے ہیں:

"ہمارے عناصرِ ترکیبی کا ایک خاص مقصد کے تحت ترکیب پانا گویا مُوجد کے ساتھ عہد نامہ باندھنا ہے کہ وہی ہمارا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ عناصر خود بخود بغیر کسی سببِ اوّل کے اس حقیقت کذائی پر مجتمع نہیں ہو گئے جس طرح حروفِ تہجی خود بخود کتاب نہیں بن جاتے ——— گویا ہمارا نفسِ وجود ہی اپنے مُوجد پر شاہد ہے۔ اب کوئی شخص یہ عذر نہیں کر سکتا کہ یارب ہمیں اجر و عتاب کی کیا خبر تھی کہ شرک یا کفر سے قیامت کے دن ہم پر کیا بیتے گی، ہم نے اپنے آباد اجداد کی تقلید کی، کیا یہ انصاف ہے کہ لوگ جو اسیرِ باطل تھے اور جو قفسِ عنصری میں بند وجودِ ذات سے بے خبر تھے، انہیں چند روزہ زندگی کی غلط کاریوں کے بدلے ابدی ہلاکت میں چھوڑ دیا جاتے۔ خدا کی حجتِ قاطعہ ہے کہ اقرارِ الست، ہر علیحدہ علیحدہ شخص سے لیا گیا ہے یعنی خدا کے ربِّ مطلق ہونے پر ہر کوئی خود برہان ہے۔ پس جو کوئی اپنی کج عقلی کے دخل سے منکر ہُوا، وہ بھی موردِ الزام ہُوا۔" [۱۹]

مطلب یہ کہ رُوح کے اندر ایک اضطراب کا پیدا رہنا ایک قدرتی امر ہے۔ اگر اس اضطراب کی لِم معلوم ہو جاتے تو راستہ صاف نظر آنے لگتا ہے ورنہ بنو آدم اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بقول حضرت علامہ اقبال خدا پرستی کا فطری عنصر جب مقصود کو واضح طور پر سمجھ نہیں سکتا تو ذوقِ عبادت و عبودیت کی تسکین کے لیے

غیر اللہ کے آگے جھکنے لگتا ہے بلکہ خود ہی صنم تراشتا ہے اور ان کے سامنے خود ہی سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ حضرت علامہ کے شعرِ ذیل میں یہ مفہوم بڑے فنکارانہ انداز میں بیان ہوا ہے ؎

ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد
عشق فریب می دہد جانِ امیدوار را ۶۲

بالفاظِ دیگر یہ رُوح کی بھوک ہے جو عبادت میں تسکین ڈھونڈتی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اسے حقیقی تسکین اس وقت تک میسر نہیں آتی جب تک وہ معبودِ حقیقی کی راہ پر نہیں پڑ جاتی، تاہم وہ ادھر اُدھر سجدہ ریز ہو کر اپنے آپ کو بہلا لیتی ہے ــــــ عباس محمود العقاد مرحوم کہتے ہیں :

"ولنا أن نقول إن الروح تجوع كما يجوع الجسد و إن طلب الروح بطعامها كطلب الجسد بطعامه لا يتوقف على جودة الغذاء و لا على حلاوة المذاق بل يتوقف على شعور العزيزة بالحاجة إليه ــــ" ۶۳

"ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رُوح کو اسی طرح بھوک لگتی ہے جس طرح بدن کو، اور پھر رُوح بھی اسی طرح اپنی خوراک کی طالب رہتی ہے جس طرح جسم اپنی خوراک کا ــــــ یہ امر نہ غذا کی دلآویزی اور خوبصورتی پر منحصر ہے اور نہ حلاوتِ ذائقہ پر بلکہ یہ مبنی ہے طبیعت کے شعور پر کہ وہ اس غذا کی محتاج ہے ــــــ"

غذا کیسی ہے، یہ مسئلہ بعد کا ہے۔ بھوک طبعی تقاضا ہے، وہ پورا ہونا چاہیے۔ لہٰذا رُوح اپنی بھوک مٹانے کے لیے اِدھر اُدھر بھٹکتی ہے۔ غلط اور سراسر باطل عقائد کا سہارا بھی قبول کر لیتی ہے۔ بنو آدم کی یہ بے تابی کوئی تازہ واردات نہیں۔ "پیمانِ الست" کا ذکر ابھی اوپر ہو چکا ہے ــــ لارڈ نارتھ بورن نے آدمی کی اسی اندرونی بھوک پر بالفاظِ ذیل روشنی ڈالی ہے :

The secret longing of man--hidden sometimes even from himself--is to serve God, so that when no satisfactory opportunity to do so, however indirectly, comes unsought to him from his environment, when nobody tells him how to seek it but on the contrary every influence urges him to seek something else, his secret longing remains unsatisfied and he loses his sense of loyalty and of purpose. ۶۴

یہ رُوحانی اور نہانی تمنا بدستور کسی شے کی تلاش میں مصروف رہتی ہے۔ ڈاکٹر حاتم راتے پوری اس کیفیت کو "جذبۂ عبودیت" کہتے ہیں۔ وہ جین مت اور بدھ مت کے تذکرے کے دوران میں لکھتے ہیں:

"بدھ مذہب کی طرح جین مذہب بھی محض لاالٰہ کا قائل ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ان دونوں عقیدوں کے ماننے والے جذبۂ عبودیت کی نیش زنی سے مجبور ہو کر اپنے بانیانِ مذہب ہی کو خدا کا مقام دیتے اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔"[۶۵]

حضرت مولانا روم نے یہی بات اپنے انداز میں کہی۔ یہ شعر آغازِ مثنوی کے اشعار میں سے ہے

ہر کسے کو دُور ماند از اصلِ خویش ؎
باز جُوید روزگارِ وصلِ خویش

صنم پتھر کے ہوں، دھات کے یا گوشت پوست کے، قبائلی صنم ہوں یا علاقائی، نگری صنم ہوں یا وہمی، سب باطل اور ہیچ، جب تک رُخ حریمِ ذات کی جانب نہ ہو، اور جب تک اس راہ میں جدّوجہد شروع نہ ہو جائے، فطرتِ بیتاب باطل سہاروں سے نجات نہیں پا سکتی۔ اور چونکہ ہر باطل سہارا مخلوق ہے، لہٰذا اس پر انحصار کا مطلب ہوا غیر خدا سے قرب اور خدا سے دوری۔ علاج اس کا خود شناسی ہے جہاں سے خدا شناسی کی راہ نکلتی ہے۔ پھر سارے باطل سہارے اور ہمہ ہستی اصنام بے حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بقول حضرت علامہ ؎

خودی سے اس طلسمِ رنگ و بُو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تُو سمجھا نہ مَیں سمجھا [۶۶]

خود آگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند
طلسم مہر و سپہر و ستارہ بشکستند [۶۷]

چیست دیں؟ برخاستن از روے خاک
تا ز خود آگاہ گردد جانِ پاک [۶۸]

جب جہانِ فانی کی حقیقت سامنے آتی ہے اور ظواہر کا طلسم ٹوٹتا ہے تو جان اپنی پہچان کے قابل ہوتی ہے۔ پھر پتہ چلتا ہے کہ وہاں فقط "وہی وہ" ہے اور کوئی نہیں۔ مولانا روم فرماتے ہیں ؎

باد در مردم ہوا و آرزو است چوں ہوا بگذاشتی پیغامِ ھُو است

گویا مولانا روم کی نظروں میں اہلِ ہوا اسیر ہیں، جب ہوس سے نجات پاتے ہیں تو دل سے پھر وہی آوازہ "ھُو" برآمد ہوتا ہے۔

(جاری ہے)

حواشی

۱۔ اقبال ریویو، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، جولائی ۱۹۸۴ء ص ۱۷۰
۲۔ قرآنِ حکیم سورہ ۹۵، آیت ۴
۳۔ کلیاتِ اقبال (فارسی) ص ۱۱
۴۔ کلیاتِ اقبال (اُردو) ص ۴۲۱
۵۔ کلیاتِ فارسی زبورِ عجم، ص ۵۳۸
۶۔ اقبال ممدوحِ عالم، بزمِ اقبال، کلب روڈ لاہور، ص ۱۱۴۔۱۱۵
۷۔ ایضاً ص ۱۱۶۔۱۱۷ (اور آخری جملہ ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری کا ہے)
۸۔ کلیاتِ اقبال اُردو، بانگِ درا، ص ۵۵/۵۵
۹۔ ایضاً ص ۸۱/۸۱
۱۰۔ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، اقبال کا ذہنی ارتقاء، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور ص ۳۰
۱۱۔ کلیاتِ اقبال اُردو، بانگِ درا، ص ۱۴۰/۱۴۰
۱۲۔ کلیاتِ اقبال (فارسی) جاوید نامہ، ص ۱۹۱/ ۷۷۹
۱۳۔ محمد رفیق افضل، گفتارِ اقبال، ادارۂ تحقیقاتِ پاکستان، دانشگاہ پنجاب لاہور ص ۲۵۴-۲۵۵
۱۴۔ رفیق افضل، گفتارِ اقبال، ص ۲۴۹۔۲۵۰
۱۵۔ کلیاتِ اقبال (اسرارِ خودی) ص ۱۰۔۱۱/ ص ۱۰۔۱۱
۱۶۔ مکتوب بنام سید محمد سعید الدین جعفری، خطوطِ اقبال مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور، ص ۱۶۵۔۱۶۶

۱۷- *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, 1944, p. 56.

۱۸- کلیاتِ اقبال (اُردو)، بالِ جبریل، ص ۱۴۶/ص ۴۲۸

۱۹- *The Problem of Right Conduct*, London, Longman Green and Co., 1957,p. 54.

۲۰- *Reconstruction*, p. 106.

۲۱- کلیاتِ اقبال (فارسی) ارمغانِ حجاز، ص ۱۲۲/ ۱۰۰۴

۲۲- Robert Briffault, *The Making of Humanity*, Lahore, Al-Maaraf,Gunj Bukhsh Road, 1980, p.368.

۲۳- کلیاتِ اقبال اُردو، بالِ جبریل، ص ۴۹/ ۳۴۱

۲۴- کلیاتِ فارسی، جاوید نامہ، ص ۱۵۴/ ۷۴۲

۲۵- کلیاتِ فارسی، زبورِ عجم، ص ۱۱۶/ ۵۰۸

۲۶- قرآنِ حکیم سُورۃ ۱۵، آیت ۲۹ (الحجر)

۲۷- *The Message of the Qur'an*, p. 386.

۲۸- ضیاء القرآن، جلد دوم ص ۵۴۱

۲۹- تبیان القرآن (روحِ صدق) المستقر نیا مزنگ لاہور، حصۂ سوم، ص ۱۰۷۵

۳۰- حجۃ اللہ البالغہ، ترجمہ مولانا عبدالحق، قرآن محل کراچی، ص ۴۴

۳۱- کلیاتِ اقبال، فارسی، اسرارِ خودی، ص ۱۸

۳۲- ایضاً (رموز) ص ۸۷

۳۳- کلیاتِ اقبال، فارسی، پیامِ مشرق ص ۸۵/ ۲۵۵

۳۴- *The Holy Qur'an, Elucidation*, 1968.

۳۵- کلیاتِ اُردو، بالِ جبریل، ص ۸۴/ ۳۷۶

۳۶- تفسیرِ ماجدی، سورہ ۲، آیت ۳۰، ص ۱۵

۳۷- قرآنِ حکیم، سورہ ۲، آیت ۳۰

۳۸- قرآنِ حکیم، سورہ ۲، آیت ۳۱

۳۹- کلیاتِ اقبال، فارسی، اسرار و رموز، ص ۱۴۴/ ۱۴۴

۴۰- قرآنِ حکیم، سورہ ۲، آیت ۳۳

۴۱- *Islam and Man*, Iran, University of Mashhad, p.9-10.

۴۲ - تبیان القرآن، پیر غلام وارث، ص ۲۱

۴۳ - کلیاتِ اقبال (فارسی) زبورِ عجم، ص ۱۶۲/ ۵۵۴

۴۴ - فکرِ اقبال، نفیس اکیڈمی، حیدرآباد (دکن) ص ۱۷۰

۴۵ - قرآنِ حکیم سورہ ۲، آیت ۱۳۸

۴۶ - کلیاتِ اقبال، فارسی (رموز) ص ۱۵۷

۴۷ - کلیاتِ اقبال (فارسی) جاوید نامہ، ص ۷۷/ ۶۶۵

۴۸ - قرآنِ حکیم سورہ ۳۰، آیت ۳۰

۴۹ - روحِ اقبال، آئینہ ادب لاہور، ص ۱۸۶

۵۰ - تفسیر ماجدی، تاج کمپنی لاہور، ص ۸۲۰

۵۱ - *The Holy Qur'an, Elucidation*, No.35, 41.

۵۲ - فیض القدیر، محمد حسن ضیف اللہ، مصطفیٰ البابی، قاہرہ، ص ۲۴۳ (جلد دوم)

۵۲ (الف) - کلیاتِ فارسی، جاوید نامہ، ص ۵۹۶/ ۸

۵۳ - تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ، ص ۲۲۷، *Reconstruction*, p. 147.

۵۴ - ایضاً ص ۱۳۵، *Ibid*, p.90.

۵۵ - *Sophia Perennis*, Iran, The Imperial Iranian Academy of Philosophy, Tehran, 1975, Vol. I, No. 2, p. 82.

۵۶ - کلیاتِ اُردو، بالِ جبریل، ص ۳۳/ ۳۲۵

۵۷ - کلیاتِ اُردو (ارمغانِ حجاز) ص ۲۶/ ۶۶۸

۵۸ - M. Saeed Sheikh, *Studies in Iqbal's Thought and Art*, Lahore, Bazm-i-Iqbal, 1972, p. 148.

۵۹ - قرآنِ حکیم سورہ ۸۴، آیت ۶، حقائق الاسلام و اباطیل خصومہ - دار الکتاب عربی، بیروت، ص ۱۳۱ - ۱۳۲

۶۰ - قرآنِ حکیم سورہ ۷، آیت ۱۷۲ - ۱۷۳

۶۱ - تبیان القرآن (روحِ صدق) المستقر، نیا مزنگ، لاہور ص ۱۲۷

۶۲ - کلیاتِ اقبال، فارسی، زبورِ عجم، ص ۵۱/ ۴۴۳

۶۳ - "اللہ" طبع دوم، دار المعارف مصر، ص ۸

۶۴ ۔ Lord Northbourne, *Religion in the Modern World*, Lahore, Suhail Academy, 1981, p. 16.

۶۵ ۔ تصورِ بشر اور اقبال کا مردِ مومن، مکتبۂ جامعہ نگر، دہلی، ص ۱۶۵

۶۶ ۔ کلیاتِ اُردو (بالِ جبریل) ص ۲۲/ ۳۱۴

۶۷ ۔ کلیاتِ اُردو (ارمغانِ حجاز) ص ۲۶/ ۶۶۸

۶۸ ۔ کلیاتِ فارسی، جاوید نامہ، ص ۶۲/ ۶۵۰

THE IQBAL ACADEMY PAKISTAN'S

Iqbal Review

Frontier Thinking in

- ★ IQBAL STUDIES
- ★ PHILOSOPHY
- ★ METAPHYSICS
- ★ TRADITION
- ★ LITERATURE
- ★ SOCIOLOGY
- ★ HISTORY
- ★ ISLAMIAT
- ★ ARTS
- ★ MYSTICISM

LOCAL

1. SINGLE COPY	–Rs.20/–
2. SINGLE COPY FOR STUDENTS	–Rs.15/–
3. ANNUAL SUBSCRIPTION	–Rs.60/–

FOREIGN

1. ANNUAL SUBSCRIPTION	–$10/–
2. ANNUAL SUBSCRIPTION FOR STUDENTS	–$7/–
3. ANNUAL SUBSCRIPTION FOR INSTITUTIONS BASED ABROAD	–$15/–